Fikr-o-Nasar (Islamabad) 14:10-11 (1977)

فقہ اسلامی کی تدوین جدید کا مسئلہ

○ ———— رشید احمد جالندھری

دسویں صدی عیسوی کے ایک نامور صوفی ابوالقاسم قشیری نے بزم صوفیہ کی ویرانی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ "ہرچند کہ خیمے اب بھی ہیں اور ان کے مکیں بھی لیکن لیلیٰ کا چہرہ کہیں نظر نہیں آتا افسوس! ہمارے زمانے میں اس قبیلہ عشاق کا جو اپنے پیچھے اپنے قدموں کے نشان چھوڑ گیا ہے کوئی فرد باقی نہیں رہا"[1]

قشیری کے بعد بارہویں صدی کے ممتاز صوفی شیخ ابن عربی نے اپنے عہد کی بربادی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"قشیری کے عہد میں لیلیٰ نہ سہی خیمے تو باقی تھے اب تو خیمے بھی باقی نہیں رہے" افسوس! یہی المیہ فقہ کے ساتھ بھی دہرایا گیا۔ فقہ اور فقیہ کے ساتھ عظیم الشان روایات ..... وابستہ ہیں، لیکن وقت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ آج یہ دونوں لفظ اپنی آب و تاب کھو بیٹھے شاید الفاظ و معانی کو بھی بڑھاپے کی منزل سے گزرنا پڑتا ہے ورنہ لفظ "فقیہ" صاحب بصیرت اور یکتائے روزگار کے لئے بولا جاتا تھا۔ وقت کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہوتا تھا جسے فقیہ نہ سلجھا سکے اور حکومت کا کوئی منصب ایسا نہ تھا جسے فقیہ اعزاز نہ بخشتے۔

لفظ "فقہ" غور و فکر اور حکمت و دانائی کے معنی میں بولا جاتا ہے اور جو لوگ بصیرت سے عاری ہیں اگو گوشت پوست کے لحاظ سے تو انہیں آدمی ہی کہا جائے گا، لیکن وہ آدمیت کے مقام سے فروتر ہی رہیں گے۔ قرآن مجید نے انہی لوگوں کے بارے میں کہا ہے کہ "ان کے پاس دل تو ہیں لیکن

بصیرت سے کورے" ۲؎ قرآن مجید نے ایک دوسرے مقام پر مسلمانوں کو دینی بصیرت کے حصول کی ترغیب دی ہے ۳؎ سوال یہ ہے کہ دین کیا ہے؟ جواب میں نہایت ہی اختصار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ دین کائنات میں انسان کے مقام کی' ایسے ہی انسان اور خدا کے باہمی رشتے کی خبر دیتا ہے۔ مزید یہ کہ دین زندگی کو ایک بلند نصب العین دیتا ہے ۴؎ ان مسائل پر غور و فکر کرنے والے کو فلسفی، فقیہ اور عالم کے خطابات سے نوازا گیا ہے' یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ لفظ فلسفی، فقیہ، عالم اور صوفی قریب قریب ایک ہی معنی میں بولے جاتے تھے اور وہ تھے رُخِ حقیقت سے نقاب اٹھانے والے پاکیزہ انسان، لیکن خدا جانے کہ وقت نے ان کے خلاف کیا سازش کی کہ فلسفہ کے چہرے پر تو خیر اب بھی تھوڑی بہت رونق باقی ہے۔ لیکن فقیہ کے عمامے کو خشکی اور اجتماعی مسائل سے بے اعتنائی کا نشان قرار دے دیا گیا اور صوفی کے دامن پر رہبانیت، کام چوری اور جمود کے دھبے لگا دیئے گئے' اس المیہ کا ماتم ہمارے عہد میں جمال الدین افغانی' محمد اقبال اور ابوالکلام آزاد نے بھی کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر مسلمان ایک ملت اور زندہ قوم کی حیثیت سے اپنا لوہا منوانا چاہتے ہیں اور انسانی سوسائٹی میں صحت مند اخلاقی قدروں کو لے کر خدمت کا حوصلہ رکھتے ہیں تو پھر انہیں سنجیدگی سے از سر نو اپنے اجتماعی اور مروجہ مذہبی نظام کا جائزہ لینا چاہیئے اور دیکھنا چاہیئے کہ یہ نظام کہاں تک قرآن مجید کے پیغام، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور عہدِ حاضر کے تقاضوں کا ساتھ دے رہا ہے' ان امور کا جائزہ لینا اس لئے بھی ضروری ہو گیا ہے کہ موجودہ وقت میں دنیا کا قانون جس نے آسمانی تعلیم سے اپنے رشتے توڑ لیے ہیں، ——— اپنی پوری خوبیوں کے باوجود معاشرے کی بے چینی کو دُور کرنے میں کامیاب نہیں رہا۔ مزید یہ کہ دنیا میں تلاشِ حق کرنے والوں نے اس حقیقت کا سراغ پا لیا ہے کہ اسلامی شریعت ایک ایسا قانون ہے جس سے تجاہل نہیں برتا جا سکتا۔ لیہ (Leigh) میں ۱۹۳۸ء میں اہل قانون نے ایک بین الاقوامی اجتماع منعقد کیا جس میں مصری وفد نے بھی شرکت کی۔ اس اجتماع نے اپنے اختتام پر یہ بات تسلیم کر لی:

۱۔ قانون کے تقابلی مطالعہ کے سرچشموں میں سے ایک سرچشمہ اسلامی شریعت بھی ہے۔

۲۔ شریعتِ اسلامیہ وقت کا ساتھ دے سکتی ہے اس میں داخلی طور پر قوتِ نمو موجود ہے۔

۳۔ شریعت اسلامیہ اپنی ذات میں ایک مستقل ادارہ ہے [۵]

مصر کے اہل علم نے از سر نو حالیہ فقہی نظام کا جائزہ لیا، انہیں اس نتیجہ پر پہنچنے میں دیر نہیں لگی کہ آج کی فقہ دورِ انحطاط کی چند کتابوں کے مجموعہ کا نام ہے، اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اسلامی قانون کی ترجمان ہیں یا شریعت اسلامیہ کے قانونی پہلو کی نمائندہ، ایک عبث توقع ہے۔ محمد خضری نے اس افسوس ناک صورتِ حال پر آنسو بہاتے ہوئے لکھا کہ

"کیا یہ عجیب بات نہیں کہ جو کتابیں اسلام کے عہد عروج میں لکھی گئیں وہ تو یک قلم نظروں سے اوجھل ہیں اور یہ وہ کتابیں ہیں جو چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں لکھی گئیں ..... یہی وجہ ہے کہ آج ہم امام محمد بن حسنؒ، امام محمد بن ادریس شافعیؒ، امام مالک بن انسؒ اور دوسرے ائمہ کی کتابوں کو نہیں پڑھتے، لے دے کر خلیل کی مختصر، زکریا انصاری کی منہج اور نسفی کی کنز ہمارے ہاتھوں میں ہے۔"

خضری نے صاف طور پر لکھا کہ فقہ اسلامی کی موجودہ تعلیم اور پڑھائی جانے والی کتابیں خود فقہ اسلامی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں [۶]

مقام مسرت ہے کہ اب علماء کرام نے فقہ اسلامی کی حالتِ زار پر مرثیہ گوئی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے مثبت قدم بھی اٹھائے۔ سب سے پہلے شیخ محمد عبدہٗ نے اس صدی کے آغاز میں مصر میں شرعی محاکم پر مفصل رپورٹ لکھی اور بتایا کہ شرع کے نام سے کس قدر غیر شرعی کاروبار پھیلا ہوا ہے [۵]

شیخ موصوف نے مزید کہا کہ شرعی عدالتوں کو فیصلہ دیتے وقت کسی ایک فقہی مذہب کا پابند نہیں ہونا چاہیے کیونکہ عدالت کا نصب العین ایسا انصاف فراہم کرنا ہے جو قرآنِ مجید کی تعلیم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے زیادہ سے زیادہ قریب ہو چنانچہ وقت کے ساتھ ساتھ شرعی عدالتوں میں فقہ حنفی کا دامن وسیع ہوتا گیا اور انسان اور مفادِ عامہ کی خاطر دوسرے سنی فقہی مذاہب کی طرف بھی رجوع کیا گیا۔

ہر چند کہ آج تک مصر میں یا مسلم دنیا کے اکثر مقامات پر اسلامی قانون کا دائرہ کار صرف شخصی

قوانین (Personal Laws) تک محدود ہے۔ دیوانی یا فوجداری مقدمات نپولین کوڈ کے تحت طے پا رہے ہیں [۸] لیکن یہ تمنا اہلِ فکر کے سینوں میں برابر مچل رہی ہے کہ ہمارے پورے قانون کی بنیاد شریعت اسلامیہ ہونی چاہیئے۔ مصر کے ایک ممتاز قانون دان جناب عبدالرزاق سنہوری اس بارے میں لکھتے ہیں:

"یہ امر کہ ہمارے قانون کی خشتِ اوّل اسلامی شریعت ہونی چاہیئے ایک عزیز ترین تمنا ہے جو سینوں میں دھڑک رہی ہے، لیکن قبل اس کے کہ یہ حقیقت کا روپ بدلے...... شریعت اسلامیہ کی تحقیق کے لئے ایک زبردست علمی نشاۃ ثانیہ کی ضرورت ہے........ اگر ہم شریعت اسلامیہ کی راہ ہموار کرنے میں کامیاب ہوگئے تو یہ امر ہمارے عظیم الشان ورثے، ہماری فقہ، ہماری عدالت اور ہماری قانون سازی میں آزادی وخود اعتمادی کی نئی روح پھونک دے گا۔ اس سے نہ صرف ہم دنیا کے سامنے ایک نئی روشنی کے ساتھ آئینگے بلکہ قانون کی بین الاقوامی ثقافت کے بعض پہلوؤں کو نئی روشنی بھی عطا کرسکیں گے۔ [۹]

جب شریعتِ اسلامیہ کو قانون کی بنیاد قرار دینے کے بارے میں ممتاز اہل قانون اس انداز پہ سوچنا شروع کردیں تو پھر ہمیں حالات سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ ہماری رائے یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں اسلامی قانون کو تدریجی طور پہ نافذ کرنے کے لئے دو باتوں کا سنجیدگی سے جائزہ لینا ضروری ہے۔

(۱) پاکستان کے مختلف حصوں میں سماجی یا شرعی نظام کا جائزہ لیا جائے کہ اس نظام کو کیوں کر اسلامی قانون کے مطابق بنایا جا سکتا ہے۔ مثلاً بلوچستان میں قبائلی نظام رائج ہے جس کی بنیاد عرف (Custom) پر ہے [۱]۔ مثال کے طور پہ خون بہا کو لیجیے۔ اگر ایک عام بلوچ بلوچ کے ہاتھوں قتل ہو جاتا ہے تو اس کا خون بہا ڈیڑھ ہزار روپے ہے اور جرمانہ (ریاست کی طرف سے) پانچسو روپے۔ اگر بلوچ سردار قتل ہو جائے تو اس کا خون بہا بیس ہزار روپے سے ایک لاکھ روپے تک ہے، لیکن اگر بلوچ کے ہاتھوں غیر بلوچ قتل ہو جائے تو اس کا خون بہا دو یا تین سو روپے اور جرمانہ صرف ایک سو

---

[۱] جس وقت یہ سطور لکھی گئیں۔ قبائلی نظام رائج تھا، لیکن مارچ ۱۹۷۶ء میں ایک حکم کے ذریعہ اس نظام کو ختم کیا جا چکا ہے۔

روپے ـــــــ اب سوال یہ ہے کہ اس "سماجی انصاف" کو اسلامی انصاف کے ڈھانچہ میں کیوں کر ڈھالا جائے اور اس کے لئے کون سی راہ اختیار کی جائے ؟ ـــــــ ایک اور مثال سنئے سابق ریاست چترال میں "شرعی نظام" رائج تھا۔ مثلاً زکوٰۃ، عشر لیا جاتا تھا، قاضی اور مفتی بھی تھے جو بستیوں میں قصاص کا بھی فیصلہ دیتے تھے، ریاست میں نیم سرکاری مدارس بھی تھے۔ جن میں درس نظامی پڑھایا جاتا تھا اور اساتذہ کرام کی تنخواہیں سرکاری خزانے سے ادا کی جاتی تھیں، لیکن جب چترال کا الحاق پاکستان سے ہوا تو یہ "شرعی نظام" موقوف کر دیا گیا ؎ حالانکہ چاہیئے تو یہ تھا کہ اس نظام کو جو "شرع" کے نام سے جاری تھا صحیح معنی میں شرعی بنانے کے لئے کوئی نیا قدم اٹھایا جاتا، لیکن ایسا نہیں کیا گیا ـــــــ ان دو ایک مثالوں کے بیان کرنے سے مقصد یہ ہے کہ ملک کے سماجی اور اجتماعی حالات کا مطالعہ کیا جائے اور ان تمام امور پر ایک مفصل تحقیقی رپورٹ مرتب کی جائے پھر اس کی روشنی میں سفارشات مرتب کی جائیں ورنہ صرف آتشیں تقریروں سے اسلامی شریعت کبھی بھی نافذ نہ ہو سکے گی۔ کیا ہی اچھا ہو کہ چند محنتی، ذہین اور اہل علم حضرات سیاسی شورشوں سے یک قلم الگ رہ کر ملک کے مختلف حصوں کے رسم و رواج اور دستور و قانون کا تحقیقی مطالعہ کریں، اور اس کی روشنی میں اسلامی قانون کو بروئے کار لانے کے لئے وسائل پر سوچ بچار کریں کیونکہ برصغیر پاک و ہند میں برطانوی راج نے اپنے مفاد کے لئے جو سیاسی، قانونی اور تعلیمی نظام رائج کیا۔ اس نے یہاں کے عام باشندوں خاص کر مسلمانوں کو اخلاقی اور روحانی اقدار سے بہت پیچھے دھکیل دیا، جس کا ایک مظاہرہ یہ تھا کہ اسلامی قانون کو پرسنل لاز تک محدود کر دیا گیا ـــــــ اور اس پر بھی طرفہ تماشہ یہ کہ نجی معاشرت سے متعلق قوانین بھی اسلامی شریعت کی روح سے یک قلم خالی تھے۔ مسلمانوں کی ایک جماعت نے مسلسل یہ کوشش کی کہ مسلمان کم از کم اپنی انفرادی زندگی ہی میں شریعت کی پیروی کریں اور نکاح، طلاق، میراث، اور اوقاف سے متعلق پیش آمدہ مشکلات کا حل اسلام کی صحیح تعلیم میں تلاش کریں۔ سرکاری سطح پر عبداللہ کا شریعت بل اور محمد احمد کاظمی کا خلع بل (مرکزی اسمبلی میں)، انہی کوششوں کی ایک کڑی تھا ؎ انفرادی طور پر علماء کرام نے اسلامی فقہ پر قلم اٹھایا اور بتایا کہ اسلامی فقہ جسے آج ہمارے ہاں کا ایک گروہ دفتر بے معنی قرار دیتا ہے، ہمارے تمدن کا ایک عظیم الشان ورثہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی تمدن کی قدر و قیمت اور حسن و خوبی کا صحیح اندازہ

اس کے قانون ہی سے لگایا جا سکتا ہے کہ کہاں تک اس تمدن کا قانون انسانی وقار اور آزادی کی ضمانت دیتا ہے۔ اسلامی فقہ نے اپنے پہلے دور میں انسانی وقار اور آزادی کی حفاظت کے لئے جو بحثیں کی ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام انسان کو کس اونچے مقام پر دیکھنا چاہتا ہے نیز یہ کہ اسلام کی نگاہ میں آزادی کا تصوّر کس قدر پاکیزہ ہے۔ لیکن ہمارے دورِ انحطاط میں انسانی وقار کی خود مسلمانوں کے ہاتھ سے جو مٹی پلید ہوئی وہ بھی ہماری تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے جس کی طرف ہم نے بار بار اشارہ کیا کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟ قانون اور سوسائٹی کا مقدس رشتہ کیوں ٹوٹا؟ اور اب اس رشتے کو کیسے جوڑا جائے؟ اہلِ فکر کی ایک قلیل جماعت نے مقدور بھر ان اسباب کی نشان دہی کی، مذہبی امور میں جمود و تصلّب اور تشدّد و غلو پر عہدِ جدید میں سب سے پہلے شاہ ولی اللہ نے الانصاف، اور عقد الجید میں لکھا اور بتایا کہ اسلامی فقہ کی امتیازی شان کیا ہے؟ اختلاف رائے کی جو فقہاء کے ہاں پایا جاتا ہے، صحیح صورتِ حال کیا ہے؟ یا زندگی کی مشکلات پر قابو پانے کے لئے اجتہاد نے کیا کام کیا اور اجتہاد و تقلید کی صحیح پوزیشن کیا ہے؟

(ب) اموی اور عباسی دَور کا بھی جائزہ لیا جائے کہ اسلامی قانون زندگی کے کس کس شعبے میں جاری تھا۔ کیونکہ یہ کہنا خالی از حقیقت نہ ہوگا کہ مسلمانوں کے عہد عروج میں حکمران طبقہ نے اسلامی قانون کو پوری طرح سے نہیں اپنایا، سیاست و اقتدار کا شعبہ ہمیشہ قانون کی قلمرو سے باہر رہا، فقہ اسلامی نے طہارت، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، نکاح اور طلاق کے مسائل کی جزئیات کا اس حد تک احاطہ کیا کہ انسان داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا، لیکن سلاطین و وزراء، حکام اور فوجی کمانڈروں نے لوٹ کھسوٹ کا جو بازار گرم کر رکھا تھا اور دادِ عیش دینے کے لئے جو جو رنگ رلیاں منائی جاتی تھیں یا اپنے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے اپنے ہی شریک اقتدار ساتھیوں کو لوٹ لیا جاتا تھا یا خود سلاطین و خلفا ہی کو الگ کر دیا جاتا تھا غرضیکہ اس استبدادی اور شاہی نظام کو جو ہماری تاریخ کا ایک المناک باب ہے قانون کے دائرہ میں لانے کے لئے ہماری فقہ نے خاموشی اختیار کی، تاریخ کا طالب علم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ بادشاہوں کے درباروں میں اور وزراء کے محلات کے پاس اسلامی قانون کو پھٹکنے نہیں دیا جاتا تھا۔ یہاں تعزیرات و قصاص بے بس تھے۔ اس اندوہ ناک صورتحال پر جو صدیوں

سے ہمارے معاشرے کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہے کبھی بھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا گیا کہ آخر ان مشکلات پر قابو کیسے پایا جائے اور اہل اقتدار پر قانون کی حکمرانی قائم کرنے کے لئے کن کن وسائل کا سہارا لیا جائے؟ اس لئے آج جو لوگ پاکستان میں خوش اعتقادی سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ مسلم عہد حکومت میں اسلامی قانون زندگی کے ہر شعبہ میں جاری و ساری تھا، وہ حقائق کی دنیا میں نہیں رہتے۔ تاریخ طبری، کامل اور مسعودی کے اوراق اُلٹتے جائیے اور دیکھیے کہ کیا اموی و عباسی سلاطین کی زندگیاں (دو چار کو چھوڑ کر) قانون کے سامنے سرنگوں نظر آتی ہیں۔ سلاطین و خلفاء کے عزل و نصب کا سوال ہو یا وزراء و حکام کی باہمی چپقلش کا مسئلہ ان سب کا فیصلہ قانون نہیں، تلوار کرتی تھی خود ہمارے ہاں مغل دربار کے فیصلے جن کا تعلق حاکم سے ہوتا، تلوار نے کئے ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ آج اسلامی قانون کی اہمیت کو جاننے اور عملی جامہ پہنانے کے لئے جہاں پاکستانی معاشرے کے رسم و رواج، نظام تعلیم اور مروجہ قوانین کا جائزہ لینا ضروری ہے وہاں اسلام کے صدر اوّل میں اس قانون کی صحیح پوزیشن کا جائزہ بھی از بس ضروری ہے نیز یہ کہ موجودہ دنیا میں جب کہ مغرب کا قانون اپنی سیادت کا دعویدار ہے قانون کا تقابلی مطالعہ نہ صرف اسلامی قانون کی راہ ہموار کرنے میں ممد و مددگار ثابت ہوگا بلکہ اسلامی قانون کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ بھی لگایا جا سکے گا۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اپنا اور اپنے وقت کا محاسبہ کئے بغیر جو لوگ اسلامی قانون کو عملی طور پر دیکھنے کی تمنا رکھتے ہیں، افسوس وہ تمناؤں میں الجھائے گئے ہیں۔

ہمیں اپنے قانون دان دوستوں اور محترم علماء کرام سے اُمید ہے کہ ان کی مشترکہ کوششوں سے اسلامی قانون کا ایک ایسا باقاعدہ مجموعہ مرتب ہو سکتا ہے جو ہماری تاریک راہوں کو روشن کر سکتا ہے یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کا حصول ناممکن ہو، ہم ہی نہیں بلکہ پوری انسانی جماعت سماجی انصاف کے قیام کے لئے نئے نئے تجربے کر رہی ہے جن سے ہم فائدہ اُٹھا سکتے ہیں کیونکہ جدید قانون میں جو چیزیں اسلام کے بنیادی اصولوں سے متصادم نہیں ان کو اختیار کرنے میں بشرطیکہ ہمارے مفاد میں ہوں کسی عالم نے اعتراض نہیں کیا۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اسلام اور جدید قانون میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ہمارے قانون کی بنیاد

اخلاقی اقدار پہ ہے جن کا سرچشمہ وحی ہے. سوسائٹی کا مفاد نہیں۔ دراصل ہم اس اصول کو نہیں مانتے جو یہ کہتا ہے کہ جو چیز سوسائٹی کے لئے سود مند ہے، اچھی ہے اور اس امر کا فیصلہ سوسائٹی کرتی ہے۔ ہم اس مفروضے کو نہیں مانتے کیونکہ یہ عین ممکن ہے کہ ایک چیز جدید قانون کی نظر میں مفید اور اچھی ہو، لیکن وحی کی نظر میں نقصان دہ اور برائی، مثلاً سود مغربی قانون کی نگاہ میں اچھائی ہے، لیکن اسلام نے اسے برائی شمار کیا ہے یا یہ کہ مرد عورت کے آزاد جنسی تعلقات، جدید قانون کی نگاہ میں جائز ہیں بشرطیکہ ان کی بنیاد جبر پہ نہ ہو۔ لیکن اسلام نے اسے بُرائی سے تعبیر کیا ہے ۲۱ یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیئے کہ اشیاء کے حسن و قبح کی ترازو جن لوگوں کے ہاتھ میں دے دی گئی ہے وہ کون لوگ ہیں؟ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے جن چیزوں کو سوسائٹی کے لئے مفید قرار دیا ہے وہ حقیقت میں سوسائٹی کے لئے نقصان دہ ہوں۔ آج ساری دنیا میں سرمایہ داروں کے خلاف بغاوت ہے اور اسے ایک بُرائی قرار دیا گیا ہے، لیکن اسی "سرمایہ داری" کو صدیوں تک سوسائٹی پر مسلط کیا گیا اور قانون کی اسے حمایت حاصل رہی جن لوگوں نے سرمایہ داری کو سوسائٹی کے لئے مفید قرار دیا تھا آج وہ وقت کی نظر میں سب سے بڑے مجرم شمار کئے جاتے ہیں غرضیکہ ہمیں مارٹن لوبر (Martin Buber) کے اس قول سے کاملاً اتفاق ہے کہ "تمام اشیاء کے (حسن و قبح) کا پیمانہ خدا ہے۔ انسان نہیں"

(Man is not the measure of all things)

ان مثالوں سے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اسلامی قانون اور جدید قانون میں ٹکراؤ کا بنیادی سبب کیا ہے؟ قانون کا یہ تقابلی مطالعہ یقیناً ہمارے سامنے بُرائی کو روکنے کی نئی نئی راہیں کھول دے گا نیز یہ کہ اس سے نئے مسائل کو سمجھنے میں مدد ملے گی نئے مسائل کو سمجھے بغیر شاید ہی کوئی "فقیہ" کے معزز خطاب سے نوازا جائے۔ امام غزالیؒ نے کہا تھا کہ دنیاوی باتوں میں انسانوں کے مفاد کا خیال رکھنا فقیہ کے فرائض میں ہے اور جو لوگ اپنے عہد کے مزاج سے ناآشنا اور اپنے وقت کے مسائل سے ناواقف ہیں وہ شیخ عبدہٗ کی رائے میں عالم کہلانے کے مستحق نہیں ہیں۔ خواہ وہ دینی علوم میں کتنے ہی طاق کیوں نہ ہوں۔ چنانچہ وقت کے پیدا کردہ مسائل کا حل وہی لوگ کر سکیں گے۔ جنہیں خدا نے علم و عشق اور عقل و دانش سے نوازا ہے کیونکہ ان مسائل کو حل کر کے ہی اسلامی قانون کے نفاذ کی راہ

تیار کی جا سکتی ہے۔ مثلاً خود ہمارے عہد میں پہلے تحدیدِ ملکیت کا سوال اٹھا پھر تحدیدِ نسل کا۔ اور اب شاید تھوڑے دنوں تک تحدید مبانی (مکانات) کا سوال بھی اٹھے کہا جاتا ہے کہ بینک میں پڑے ہوئے سرمایہ پر سود لینا ناجائز ہے۔ حرمت کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس طریق سے آدمی کام کئے بغیر نفع وصول کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر سرمایہ مکانات کی صورت میں محفوظ کر لیا جائے اور مکانات کو آگے کرائے پہ دے دیا جائے تو کیا یہ امر سود کے ذیل میں نہیں آتا۔ اس بات کا آخری فیصلہ سوچ بچار کے بعد یقیناً علمائے کرام ہی کر سکتے ہیں۔ آج کل مکانوں کو کرایہ پہ دینے کا کاروبار تجارتی نقطۂ نظر سے بڑا مفید ہے اس پر مستزاد یہ کہ ہمارے ہاں بعض لوگ اپنی رہائش کے لئے ایک نہیں کئی کئی مکانات بنواتے ہیں اور وہ بھی بہت بڑے بڑے جبکہ لوگوں کی اکثریت ایسی ہے کہ ان کے پاس ایک مکان بھی نہیں ہے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ سماجی انصاف کے پیشِ نظر حکومتِ وقت جذبۂ نمود کے اس اظہار پہ پابندی لگا سکتی ہے اور ضرورت سے زائد مکانات کو چھین بھی سکتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ مسلسل دو دن گوشت کھانے سے روکتے تھے ایسے ہی ایک سپاہی کو چار ماہ سے زیادہ اپنے بیوی بچوں سے الگ نہیں رکھتے تھے۔ آپ کی سماجی اصلاحات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بے جا نہ ہوگا کہ آپ معیارِ زندگی پہ پابندی لگانے کے حق میں تھے۔ معیارِ زندگی کی ایک نہایت ہی بھونڈی شکل ہمارے ہاں جہیز کی نمائش اور ولیمہ کی شاندار دعوت ہے اور یہ دیکھ کر انتہائی دکھ ہوتا ہے کہ اس نمائش میں وہ لوگ بھی شریک ہیں جو صبح و شام اسلامی قانون کو نافذ کرنے کا راگ الاپتے رہتے ہیں۔ اگر آج حضرت عمرؓ زندہ ہوتے تو وہ جذبۂ نمود کی ان نمائشوں پر یقیناً برق بن کر گرتے۔

غرضیکہ اس قسم کے مسائل میں جو اسلامی انصاف کی روشنی میں حل طلب ہیں، ہماری سوسائٹی صدیوں سے ایسے بلند نظر فقیہوں کی راہ تک رہی ہے جو اپنی مسلسل کاوشوں سے ہمیں ایسا قانون دیں جس میں ان کی عزت، مال، اور محنت محفوظ ہو انہی لوگوں سے ہمیں توقع ہے کہ وہ ہماری سوسائٹی کے چہرے سے مکر و نفاق کا نقاب اُلٹنے میں اپنا تاریخی کردار ادا کریں گے اور اس طریق سے اقبال و جناح کی سرزمین کو اسلامی قانون کی جلوہ گاہ بنا کر دم لیں گے۔

(بشکریہ مقدمہ تدوینِ فقہ از مناظر احسن گیلانیؒ۔ لاہور ۱۹۷۶ء)

حواشی

۱۔ رسالہ قشیریہ مقدمہ، واما الخیام فانہا کخیامہم، واری نساءالحی غیر نسائہا

۲۔ اعراف ۱۷۹ —

۳۔ التوبہ ۱۲۲۔

۴۔ تفصیل کے لئے دیکھئے چٹان لاہور ۲۲ مئی ۱۹۷۲ء -

۵۔ تاریخ الفقہ الاسلامی ص ۱۳۱ ط۔ (قاہرہ ۱۹۵۷ء)۔

۶۔ تاریخ التشریع الاسلامی، قاہرہ ۱۹۳۰ء ص ۳۸۶ - ۳۸۸ نیز ملاحظہ کیجئے ازمۃ الفقہ الاسلامی از محمد یوسف موسیٰ رسالہ "ازہر" اپریل ۱۹۵۳ء -

۷۔ تفصیل کے لئے دیکھئے رسالہ المنار ——— کے پہلے شمارے اور تاریخ الاستاذ الامام از رشید رضا ج اول -

۸۔ افسوس! آج ہم نے شریعۃ اسلامیہ یا قانون کو نجی معاشرت یا عبادات تک محدود کر دیا ہے۔ معاملات اسلامی قانون میں نہیں آتے۔ اس افسوس ناک صورتحال کی ذمہ داری علماء ازہر پر ہی عائد ہوتی ہے جن کی لغزشوں کی وجہ سے گذشتہ صدی میں والی مصر اسماعیل پاشا نے نپولین کوڈ کا عربی ترجمہ کرایا اور مصر میں نافذ کیا تفصیل کے لئے دیکھئے تاریخ الاستاذ الامام ج ۱ ص ۶۱۰، واقعہ یہ ہے کہ فقہ اسلامی کی تدوین جدید کے لئے یہ کتاب (تاریخ الاستاذ الامام، انتہائی مفید ہے۔

۹۔ محمد یوسف موسیٰ تاریخ الفقہ الاسلامی ص ۱۶ قاہرہ (۱۹۵۸ء) -

۱۰۔ فقیر نے اگست ۱۹۷۳ء میں چترال کی مجلس علماء سے مل کر چترال کے مذہبی اور اجتماعی امور کے بارے میں تفصیلات حاصل کی تھیں اس سلسلہ میں سابق مہتر چترال کے صاحبزادے ڈاکٹر سردار الملک نے فقیر کو قیام چترال میں سہولتیں فراہم کی تھیں خیال تھا کہ چترال کے شرعی نظام پر ایک تفصیلی مقالہ سپرد قلم کروں، لیکن وقت نے تاحال اس کی اجازت نہیں دی۔ اس کا ایک

بڑا سبب یہ ہے کہ اس مقالے کے لئے دوبارہ چترال جانا چاہتا ہوں اگر کوئی اہل علم چترال جا کر اس موضوع پر کام کریں تو انہیں قیمتی معلومات مل سکتی ہیں۔

۱۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، ہندوستان میں قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ" از طفیل محمد، ط ندوۃ المصنفین دہلی ۱۳۵۸ھ۔

۱۲۔ تفصیل کے لئے دیکھئے احمد موافی "منہج الشریعۃ والقانون فی تقریر الاحکام" فاضل مقرر کا یہ مقالہ ازہر یونیورسٹی نے "المحاضرات العامۃ" ۲۔ ط۔ ۱۹۶۰ء میں شائع کیا ہے۔

****